غلام گردش

## ناقدری!

ساغر صدیقی کا تعلق انبالہ سے تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے پیدا ہونے والا انسان' پیدائشی شاعر نہیں تھا۔ بچپن میں استاد حبیب حسین کی بدولت اردو شاعری سے شغف پیدا ہوا۔ بچپن میں امرتسر میں لکڑی کی کنگھیاں بیچنے کا کام شروع کیا۔ اور ساتھ ہی بلا کی شاعری بھی۔ پاکستان بنا تو لاہور منتقل ہو گیا۔ یہاں مشاعروں کی جان گردانا گیا۔ ایسی ایسی کمال غزلیں اور تحت الفظ پڑھنے کے دلکش انداز نے ہر ایک کو ساغر کا گرویدہ بنا دیا۔ ساغر ایک حساس انسان تھا۔ شاعر تھا۔ اس معاشرے میں اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں کوئی بھی انسان سوچنا شروع کر دے۔ ساغر لفظوں کا کاریگر تھا۔ شعر کہنے کے لئے احساس تو ایک ضروری جزو ہے۔ جب پاکستان کے ابتدائی دور میں ساغر نے کمال کرپشن اور ہوس زر دیکھی تو آہستہ آہستہ مایوسی اس کے جگر میں جگہ بنا گئی۔ اس کی روح تک اداس ہو گئی۔ ناقدری کے سبب فٹ پاتھ پر آ گیا۔ اندرون لاہور کی گلیاں مسکن بن گئیں۔ پھٹے پرانے کپڑے' بڑے بڑے بے ترتیب بال اور مفلوک الحالی اب اس کے مستقل ساتھی تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ ایک لازوال شاعر ہے۔ لوگ اس سے چند ٹکوں کے عوض غزلیں خریدتے تھے اور اپنا کلام بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ ساغر کی مجبوری سے ادبی قزاقوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کا کلام خرید خرید کر خود شاعر مشہور ہو گئے۔ ساغر غربت اور نشہ کے ایک ایسے گرداب میں ڈوب گیا۔ جہاں سے پوری زندگی باہر نہ نکل پایا۔ 1974ء کی ایک صبح کو اندرون لاہور کے ایک فٹ پاتھ پر ساغر زندگی کی بازی ہار گیا۔ عجیب بات ہے کہ ٹھیک اس جگہ بلکہ اسی مقام پر' ایک سال کے قلیل وقفہ بعد اس کا واحد ساتھی' پالتو کتا بھی مرا ہوا پایا گیا۔ ساغر صدیقی کی متاثر کن شاعری آج بھی کسی بھی سنجیدہ انسان کی روح کے تار ہلا دیتی ہے۔ مکمل ناقدری کا شکار ساغر صدیقی بے آسرہ مر گیا۔ کسی بھی توجہ اور نگہداشت کے بغیر ہمارے جیسے ظالم معاشرہ کے ہاتھوں خاموشی

سے قتل ہو گیا۔ اس کا جرم تھا کیا۔ صرف یہ کہ اہل ہنر اور مفلوک الحال تھا۔ دنیاوی دولت سے محروم تنہا انسان۔ ہمارے معاشرے کے اندرونی ظلم کے لئے ایک مثالی شکار۔ اور یہی ہوا۔ صرف اور صرف چھیالیس برس کی جوان عمر میں فانی دنیا سے چلا گیا۔

موسیقی میں ایک مستند نام' استاد سلیم اقبال کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ فلموں کو لازوال گانے دینے والا انسان' لاہور شاہدرہ کے نزدیک ایک کچی آبادی میں نیم پختہ مکان میں سانس لیتا رہا۔ آبادی کے اندر بھی کوئی اسے نہیں جانتا تھا کہ فن موسیقی میں وہ کتنا باکمال موسیقار ہے۔ دراصل سلیم اور اقبال دو سگے بھائی تھے۔ مگر سلیم' ایک حد درجہ زرخیز ذہن کا مالک تھا۔ چنانچہ فن موسیقی میں اپنے بھائی سے زیادہ مشہور ہو گیا۔ اور اس طرح صرف سلیم اقبال بن گیا۔ کس کس بلند سطح کے گانے ترتیب دیے۔ حیرانی ہوتی ہے۔ 1966ء میں نسیم بیگم نے استاد کی سرپرستی میں امر گانا گایا۔ ''اے راہ حق کے شہیدو' وفا کی تصویرو'' یہ نغمہ آج بھی سنیں تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ شادی بیاہ میں روایت کے طور پر گایا جانے والا گانا ''دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا'' یہ بھی سلیم صاحب کی موسیقی ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا۔ اس سطح کے ان گنت گانے استاد سلیم اقبال کی موسیقی سے معمور ہیں۔ مگر سوچیے۔ ہم نے اس بلند سطح کے موسیقار کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ استاد سے میری ملاقات 1982ء میں ہوئی۔ یہ حد درجہ اتفاقیہ ملاقات تھی مگر بہت کم عرصے میں گہری دوستی میں بدل گئی۔ اس وقت میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ وہ دور سلیم اقبال کے بھرپور زوال کا دور تھا۔ کسی بھی طالب علم کی طرح میں بھی زیادہ خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ ہوتا کیا تھا۔ سلیم اقبال کا دوپہر کا کھانا گوالمنڈی میں درجنوں بار دیکھا ہے۔ سوکھا نان اور نلکے کا پانی۔ جس دن تھوڑے سے زیادہ پیسے ہوں تو ساتھ وہیں سے پکوڑے خرید لیتے تھے۔ یہ آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ لنچ کا بل دو سے تین روپے بنتا تھا۔ جو کبھی میں ادا کرتا تھا اور کبھی سلیم اقبال۔ جس دن ریڈیو پاکستان سے پیسے ملتے تھے۔ اس دن عیاشی ہوتی تھی۔

اور صاحبان! یہ عیاشی بھی کیا سادہ تھی۔ ہم دونوں' گوالمنڈی کے ملک ٹی سٹال سے سادہ چائے پی لیتے تھے۔ ہمارے معاشرے اور نظام کا ظلم ملاحظہ فرمائیے۔ گاڑی تو دور کی بات' اس قدر ناقدری تھی کہ سلیم اقبال موٹر سائیکل تک سے محروم تھے۔ کئی بار انہیں اپنی موٹر سائیکل پر شاہدرہ چھوڑ کر آیا۔ اتنا بڑا موسیقار اور اس قدر محرومی۔ صرف اور صرف گریہ کیا جا سکتا ہے۔ بعد مرگ ویسے بھی ہم مرثیہ گوئی کے ماہر ہیں۔ زندگی میں کبھی کسی اہل ہنر کی تحقیر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کرتے۔ یہی ہماری روایت ہے۔ سلیم اقبال کی سطح کا موسیقار اگر یورپ یا ہندوستان میں ہوتا' تو کم از کم ارب پتی ہوتا۔ اس کے یادگار بت اہم مقامات پر لگے ہوتے۔ مگر ہم نے اپنی ادنیٰ روایت کے عین مطابق سلیم اقبال کو مکمل نظر انداز کیا۔ آخری عمر میں سلیم صاحب کو فالج ہو گیا۔ اپنے گھر میں سہارے کا انتظار کرتے کرتے' جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ہمارا اسفلی رویہ آج بھی بعینہ یہی ہے۔

منیر نیازی صاحب ذاتی دوست تھے۔ ٹاؤن شپ لاہور میں گندے نالے کے سامنے حکومت نے انہیں ایک چھوٹا سا پلاٹ دیا تھا۔ حد درجہ عسرت میں نیازی صاحب نے وہاں ایک معمولی سا گھر بنا لیا تھا۔ ان گنت بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ خیر ساغر صدیقی اور استاد سلیم اقبال کے مقابلے میں حد درجہ خوش قسمت تھے کہ کم از کم چھت تو میسر تھی۔ مگر باقی حالات حد درجہ سفید پوشی کے تھے۔ کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا۔ شاعری کے علاوہ کوئی اور فن آتا نہیں تھا۔ اور کل وقتی شاعر کتنا امیر ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں۔ منیر نیازی بھی پوری عمر تنگدستی کا شکار رہے۔ شائد کسی کو اندازہ نہ ہو۔ پوری زندگی نیازی صاحب گاڑی نہیں خرید سکے۔ بسوں' ویگنوں پر سفر کرتے کرتے پوری زندگی گزار ڈالی۔ سنا ہے شاید آخری عمر میں حکومت نے انہیں کار فراہم کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ ایک دن ملے تو ٹاؤن شپ کی بڑی شاہراہ پر بس سٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ پوچھا کہ نیازی صاحب' کیا احوال ہیں۔ بتانے لگے۔ کہ آج کل ایک نایاب مشغلہ ڈھونڈا ہے۔ ٹاؤن شپ سے بس میں بیٹھ جاتا ہوں۔ اس کا

آخری سٹاپ یادگار پاکستان ہوتا ہے۔ چار پانچ گھنٹوں میں آنا جانا ہو جاتا ہے۔ پھر واپس آ کر سو جاتا ہوں۔ میں حیران رہ گیا۔ مگر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ منیر نیازی کا جواب آج تک یاد ہے۔ ڈاکٹر پورا لاہور بس میں پھرتا ہوں۔ مگر کھڑکی سے کوئی انسان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ دماغ بھک سے اڑ گیا۔ نیازی صاحب۔ لاہور میں تو ہر طرف انسان ہی انسان ہیں۔ نیازی صاحب نے سوچ کر کہا مجھے تو ہر طرف خونخوار جانور نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے دانتوں والے' جن کے مونہہ سے لالچ اور پیسے کی ہوس کی رال ٹپک رہی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں' انسان کہاں گئے۔ پورا شہر ہی خالی ہو چکا ہے۔ 1989ء کا واقعہ ہے۔ منیر نیازی جیسا عظیم شاعر اپنی زندگی میں مکمل ناقدری کا شکار رہا۔ ادبی لیٹروں کے مخصوص گروہ نے کبھی انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ تنہا اور زچ کرتے رہے۔ اس لئے کہ انہیں پتہ تھا کہ منیر نیازی ان سے بہت بڑا شاعر ہے۔ اور یہ امر بھی حقیقت ہے کہ منیر اپنے زمانے میں شاعروں کا امام تھا۔ ہمارے بیمار معاشرے میں اعلیٰ ظرف آدمی کے ساتھ جو تلخ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس کے شاہد آپ بھی ہیں اور خاکسار بھی۔ منیر نیازی بھی مکمل ناقدری کا شکار رہا۔

ساغر صدیقی جیسا بلند پایا شاعر ہو' یا استاد سلیم اقبال جیسا اونچا موسیقار' منیر نیازی جیسا لازوال شاعر ہو۔ ہمارے ملک میں کسی بھی میدان میں جو کوئی بھی اہل ہنر ہو گا۔ ہم اس کی گردن کاٹ دیں گے۔ خاکسار کے ان گنت شاعر' موسیقار' گلوکار' سائنسدان شناسا ہیں۔ ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ آسودہ حالی ان کے قریب نہیں پھٹکتی۔ بس اوسط درجہ کی سفید پوشی ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں باعزت کون ہے۔ صاحب آپ جواب تو جانتے ہیں۔ صرف اور صرف دولتمند کی۔ اگر آپ دو یا چار کروڑ کی گاڑی میں سفر کرتے ہیں۔ تو حکومتی عمال آپ کا چالان نہیں کریں گے۔ کوئی سائیکل' موٹر سائیکل یا چھوٹی گاڑی میں سفر کر رہا ہے تو سمجھئے کہ سرکار کا ہر ہرکارہ اس کے درپے ہو گا۔ اگر آپ کے پاس وسیع و عریض گھر ہے' نوکر چاکر ہیں' کاروبار ہے' تو سمجھ جایئے کہ یہ ملک قائداعظم نے

صرف اور صرف آپ کے لئے بنایا ہے۔ آپ ہی یہاں باعزت گردانے جائیں گے۔ یہاں عزت اور احترام کا معیار صرف اور صرف دولت ہے۔ جائز اور ناجائز دھن کی بھی کوئی تفریق نہیں۔ بس ایک پاگل پن والی دوڑ ہے۔ جس میں ہر آدمی مزید امیر ہونا چاہتا ہے۔ یہ المناک حقیقت تو سب کے سامنے ہے۔ ہمارے ملک کے کسی بھی شعبہ کے اہل ہنر لوگ ہمیشہ برباد رہینگے یا کر دیئے جائینگے۔ بس سانس لیتے رہیے اور گمان کیجئے کہ آپ زندہ ہیں!